الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۲ء

خلافت اور عربی تہذیب کی ابتداء

مولوی ابونصر محمد خالدی

Abstract

Caliphate and emergence of Arab civilization is written by Abu Nasr Muhammad Khaldi, lecturer of Usmania University, Hyderabad, Deccan, published in famous urdu journal *Siayasat* July-October 1943. Article contains important information about the arab civilzation during the period of caliphate. The article is reproduced here for our readers. References or footnotes are not given by the author.

ساتویں صدی عیسوی میں تاریخ عالم میں پہلی اور آخری مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے ایک عام تحریک کی ابتدا ہوئی۔ جس نے ایک عالمی سلطنت کی بنیاد بھی ڈال دی۔ غالباً زمانہ قبل تاریخ میں بھی جزیرہ نمائے عرب سے اس قسم کی ایک اور تحریک کی وجہ سے شام وعراق سامی نسلوں سے آباد ہوگئے ہوں۔ جو کچھ ساتویں صدی عیسوی میں واقع ہوا اس کا راستہ بیرونی ملکوں میں عربوں کی غیر منظّم ہجرت نے پہلے ہی سے تیار کردیا تھا۔ بہرطور آغاز اسلام سے پہلے اس تحریک نے کوئی عام حملہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی سنہ ۱۰ ق

م میں زنوفون کے زمانے میں دریائے فرات کے مشرقی کنارے جر کے دہانہ سے ذرا نیچے کا علاقہ ''عرب'' کہلاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں بزمانہ اسٹرابون مصر صعید کے شہر قبط کی آبادی کا نصف حصہ عربوں پر مشتمل تھا۔ شامی عرب بازنطینوں کی رعایا کی حیثیت سے اور دریائے فرات کی وادی کے عرب، ایرانیوں کی رعایا کی حیثیت سے ان دونوں سلطنتوں کی جنگوں میں سرگرم حصہ لے چکے تھے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں نے بہت سی ایسی قوموں کو اپنا مفتوح بنالیا تھا جو تہذیب میں مقابلتہً ان سے بہت برتر تھے لیکن اس کے باوجود عرب فاتحوں نے اپنی قومی خصوصیتیں اس طرح نہیں گم کردیں جس طرح کہ جرمنوں نے یورپ میں اور منگولوں نے ایشیا میں فتح کے بعد اپنی خصوصیتیں کھودی تھیں۔ بلکہ عربوں نے شام، عراق، مصر اور شمالی افریقہ کے باشندوں کو اپنی نسلی اثرات کا محکوم بنالیا۔ عربی زبان تمام دوسری زبانوں پر غالب ہوگئی لیکن یہ غلبہ عربی مملکت کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ صورت حال تو ایک حد تک عرب حکومت کی مرضی کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ محکوم قوموں میں اسلام کی اشاعت کی وجہ سے خلافت کا پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ اس لئے ان کے نقطۂ نظر سے غیر مسلموں میں سرکاری زبان کی اشاعت میں مدد دینا بہت کم پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ نصرانیوں کو عربی زبان بولنے اور اپنے بچوں کو اسلامی مدرسوں میں بھیجنے سے منع کردیا گیا تھا۔ ان ممانعتی تدبیروں کے باوجود آبادی کے ایک کثیر حصہ نے اسلام قبول کرلیا اور جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ انھوں نے عربی زبان تو ضرور اختیار کرلی۔

عربی زبان کی کامیابی کی توجیہ اس واقعہ سے ہوسکتی ہے کہ جرمنوں، ایرانیوں اور منگولوں کے عمل کے برعکس عربوں نے ابتدا ہی سے توسیع واشاعت کے لئے صرف اپنے ہی قوت بازو پر بھروسہ کیا۔ ساتویں صدی عیسوی ہی میں عربوں نے علمی تہذیب حاصل کرلی تھی چنانچہ انھوں نے اپنی ادبی زبان کو ترقی دینا شروع کردیا تھا اور شاعری اور خطابت کو ہر علمی وصف پر ترجیح دینے لگے تھے۔ بعض ادبی اصناف کو منتہائے ترقی پر پہنچا دیا گیا تھا۔ نثر مسجع اور عروض کے بعض قوافی ان کے پاس اسی وقت مستعمل تھے۔ شاعری کا موضوع یعنی قصیدہ صرف چند مضمونوں تک محدود ہوگیا تھا۔ شاعر قصیدوں کو صرف اپنے ذاتی یا اپنے قبیلے کے مفاخر بیان کرنے یا اپنے حریفوں کی ہجو کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ عربوں میں بدویانہ شاعری کے علاوہ زیادہ بہتر حضری شاعری بھی موجود تھی اور خصوصاً قبیلۂ قریش میں رائج تھی۔

خاص خاص شہری مرکزوں کے باشندوں جیسے مکہ کے قریش اور طائف کے ثقیف ابتداً

آنحضرت ﷺ کی تحریک وتبلیغ کے سخت دشمن تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو انھوں نے اس وقت جب کہ اسلام سیاسی شکل اختیار کر رہا تھا، ملت اسلامیہ کے مقتدر افراد سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ ملت اسلامیہ کی سرداری قریشیوں میں رہے گی (الائمۃُ مِن القُریش) مفتوحہ ملکوں میں قریش اور بنوثقیف نے نئے نئے شہر بنائے اور حکومت کی تنظیم کی۔ ایک عرب سپاہی کے ساتھ ایک شہری عرب کا رہنا بھی لازمات سے تھا۔ مفتوحہ ملکوں میں عربی قومیت کے احساس کو تقویت دیتے رہنا خاص کر اسی شہری عرب کی قابلیت کا رہین منت ہے۔

جیسا کہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے ہر شعبہ کی حالت ہے۔ عربی اور مقامی روایات کے اختلاط کی وجہ سے رفتہ رفتہ اسلامی وضع کے شہر وجود میں آنے لگے۔ اس وقت تک شہر کی کوئی ایسی خاص وضع پیدا نہیں ہوئی، جسے خالص ''اسلامی'' کہا جاسکے۔ بعض یورپی سیاحوں نے ان نام نہاد ''مشرقی'' شہروں کی وضع قطع کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے:

وہ کہتے ہیں مشرقی شہروں کی وضع مشرقی مطلق العنانی کے خوف سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی ایسے شہر جن میں سکونتی مکان اندرونی صحنوں میں چھپے ہوئے اور سڑکوں سے دور رہتے ہیں ایسے شہروں میں سوائے دکانوں کے آپ کو صرف کٹ گھیرے نظر آسکتے ہیں لیکن جب کہ پامپی (آئی) کی کھدائی ہوئی ہے یہ مفروضہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ اس شہر کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ رومیوں کے شہر بھی اسی قسم کے تھے۔ اس کے برعکس جن یورپی سیاحوں کو مکہ جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگئے کہ مسلمانوں کے سب سے مقدس شہر میں ''یورپی وضع'' کے ایسے مکان موجود ہیں جن کے دریچے سڑکوں کی طرف کھلتے ہیں۔ بعض سیاحوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے یمن کے شہروں میں ایسے بہت سے بلند مکان دیکھے ہیں جن کے روکار نہایت خوبصورت بنائے گئے تھے۔ ابھی یہ بات اچھی طرح واضح نہیں ہوئی ہے کہ آیا یہ چیز مقامی روایات کا نتیجہ ہے یا خارجی خصوصاً ہندی اثرات کا۔

شہروں میں قیام پذیر ہوجانے کے بعد بھی عربوں نے مدت دراز تک اپنی خاندانی اور قبائلی تنظیم باقی رکھی۔ اس طرح ایک ہی شہر کے افراد میں اتحاد و یک جہتی کا احساس اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ ایک ہی قبیلہ کے افراد میں۔ چنانچہ جب کوئی نیا شہر بسایا جاتا یا پرانے شہر میں عربوں کو آباد کیا جاتا تو ہر قبیلہ کے رہنے سہنے کے لئے ایک علیحدہ حصہ مخصوص کردیا جاتا تھا۔ بہت سے اسلامی شہر عربی طرز زندگی کی اس خصوصیت کو

پیش نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ مثلاً دمشق میں شہر کی فصیل کے علاوہ ایسی دوسری فصیلیں بھی تھیں جن میں دروازے ہیں، اور یہ دروازے ایک حصۂ آبادی کو دوسرے حصے سے اور بعض مرتبہ ایک سڑک کو دوسری سڑک سے الگ کرتے ہیں۔ ایران میں عربوں نے اسی وضع کے شہر بنائے تھے۔ گیارھویں و بارھویں صدی عیسوی کا مرو بھی اسی نمونہ کا تھا۔ مرو کے ہم عصر شہروں میں ہمدان کے اطراف کوئی عام فصیل نہیں تھی بلکہ رات کے وقت دروازے بند کرنے پر مختلف محلے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجاتے تھے۔ اس قسم کے دروازے ان سڑکوں پر بھی نصب کئے جاتے تھے جو حدود شہر سے باہر دور تک جاتی تھیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے شام میں کوئی نئے شہر نہیں بسائے البتہ آٹھویں صدی عیسوی میں بیت المقدس سے سمندر کی طرف جانے والی بڑی سڑک پر خلیفہ سلیمان (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) نے رملہ آباد کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مسلمان بھی بیت المقدس کی مذہبی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے، اس نئے شہر کی رونق روز بروز بڑھتی گئی اور سینکڑوں سال تک اسے فلسطین کے خاص شہر کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے باوصف رملہ کی اہمیت صرف مقامی تھی (عربی) تمدن کے عام ارتقاء پر اس شہر کے وجود کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ شام میں سیاسی و تمدنی سرگری کا مرکز دمشق تھا۔ چوتھی صدی عیسوی ہی میں یہ دنیا کا ایک بہترین شہر تصور کیا جاتا تھا۔ اس شہر کو بنوامیہ نے اپنا دارالخلافہ بنایا لیکن اس کا رقبہ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا کہ ہمارے تصور کے مطابق کسی عالمی مملکت کے صدر مقام کا ہونا چاہئے۔ دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک اس کی آبادی قدیم سنگ بستہ فصیل کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ نام نہاد "سیدھی" شاہ راہ جس کا ذکر انجیل کے باب اعمال پیغمبراں (۹:۲) میں بھی آیا ہے اور جو شہر کے شرقی دروازہ سے مغربی دروازہ تک چلی گئی تھی۔ اس کا طول تقریباً چار میل سے زیادہ نہیں تھا۔ اور شمالی و جنوبی دروازوں کا درمیانی فاصلہ تو اس سے بھی کم تھا۔ شہر کے وسط میں جو چوک تھا وہاں پہلے بت پرستوں کی عبادت گاہ تھی۔ بعد میں اسی عبادت گاہ پر نصرانی کلیسا بنا اور پھر سب سے آخر میں اس پر مسلمانوں کی مسجد تعمیر ہوئی۔ ابتداء میں جامع مسجد سینٹ جان اصطباغی کے کلیسا کے پہلو میں تھی لیکن خلیفہ ولید اول (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) کے زمانہ میں نصرانیوں کو اپنی عبادت گاہ مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنی پڑی۔ اس مقام پر مشہور جامع اموی کی تعمیر ہوئی۔ جس کی شان وشوکت اور خوبصورتی و دلاویزی کا مقابلہ اسلامی دنیا کی کوئی عمارت نہ کرسکی۔ خلفاء بنوامیہ کے محلات اس مسجد سے زیادہ دور نہیں تھے لیکن قرون وسطی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ان کے نشانات مٹ چکے تھے۔

دمشق کے علاوہ شام میں عربوں کی اور بھی چھاؤنیاں تھیں لیکن اہمیت کے لحاظ سے ان کا درجہ دمشق کے مقابلہ میں کم تھا۔ مثلاً دمشق کے جنوب مغرب میں جابیہ اور حلب کے شمال میں دابق۔ بعض ملکوں میں اس قسم کی چھاؤنیاں بڑے بڑے شہر بن گئی تھیں، اور ان نئے شہروں نے قدیم شہروں کی جگہ لے لی تھی۔ قاہرہ کی ابتداء اسی طرح ہوئی تھی۔ ابتداء میں عربوں نے دریائے نیل کے کنارے فسطاط نامی ایک شہری چھاؤنی قائم کی تھی۔ (یونانی۔ لاطینی میں Fossaton کے اصلی معنی خندق سے گھری ہوئی چھاؤنی کے ہیں) یہ فوجی مقام دریائے نیل کے مشرقی کنارہ قریباً تین میل لانبے اور پون میل چوڑے رقبہ پر مشتمل تھا۔ آبادی کے عین وسطی حصہ میں مسجد جامع تھی۔ اس کو اب فاتح مصر کے نام پر مسجد عمرو کہا جاتا ہے۔ دارالحکومت بھی اسی مقام پر تھا۔ تونس میں قیروان جو بعد کو ویران ہوگیا، فرات کے کنارے کوفہ، شط العرب میں بصرہ اور ایران میں شیراز اسی قسم کی شہری چھاؤنیاں تھیں۔ فتوحات کا دور گزر جانے کے بعد جب چھاؤنیوں کی ضرورت باقی نہیں رہی تو مسلمانوں نے بہت سے دوسرے شہر بھی بسائے۔ ایسے شہروں نے اکثر طویل عمر پائی جیسے مراکش کے علاقے میں فاس جو آٹھویں صدی عیسوی میں آباد ہوا تھا یا موجود روسی علاقہ میں کیانجہ (Elioavetapol) جو نویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا تھا۔ تاریخ میں ہمیں صرف ایک ہی مثال ایسی ملتی ہے جس میں عربوں نے زمانہ قبل اسلام کے ایک شہر کو از سر نو بسانے کے لئے جسے انھوں نے پہلے تباہ کر دیا تھا۔ ایک دوسرے ایسے شہر کو خالی کر دیا جو چھاؤنی سے ترقی کر کے شہر بن چکا تھا۔ یہ شہر ہراکان تھا جو باختر کے علاقہ میں آمو دریا کے جنوب میں واقع تھا۔ بعد کو بلخ نے اس کی جگہ لے لی۔

ایران اور ترکستان میں عربوں نے نہ صرف مدنی زندگی کو ترقی دینے کے لئے بڑی محنت کی۔ بلکہ شہروں کی وضع قطع تبدیل کرنے میں بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان ملکوں میں زمانہ قبل اسلام میں جو شہر آباد تھے ان میں عموماً ایک دژِ (گڑھی) ہوتا تھا اور عام آبادی کو شہرستان کہتے تھے اس کے لفظی معنی ایسے مقام کے ہیں جہاں قوت مجتمع ہو۔ لفظ مدینہ سے بھی اسی قسم کے معنی وابستہ ہیں۔ مدینہ کا یہ مفہوم عربوں نے شامیوں سے لیا ہے۔ چنانچہ مدینہ سے وہ محل مراد لیا جاتا تھا جہاں عدل و انصاف کا کام ہو۔ بازار عموماً شہر کی فصیل کے باہر دروازوں کے باز و باز و قائم کئے جاتے تھے۔ حالیہ تحقیقوں کی رو سے بازار کا یہ محل وقوع لفظاً ''بازار'' کے ابتدائی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ مغربی ایشیا کی غیر ایرانی اور غیر سامی زبانوں سے لیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم ''دروازوں پر خرید و فروخت'' ہے۔ مسلمانوں کے زیر اثر حضری زندگی رفتہ رفتہ شہرستان سے نکل کر

مضافات میں منتقل ہوتی گئی کیونکہ صناع اور تاجر زیادہ تر یہیں رہتے تھے۔ ان ہی مقاموں پر رفتہ رفتہ ان شہروں کی وضع قطع ایک نہج پر قائم ہوئی جو اس وقت تک مغربی ایشیا کے ملکوں میں موجود تھے۔ ان شہروں کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب کو بازاروں کی قطاریں ہوتی تھیں، اور جہاں یہ چاروں سڑکیں ملتی تھیں، وہاں شہر کے بیچوں بیچ جامع مسجد واقع ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان تاجر اپنے نصرانی و یہودی پیش رَوں کے قدم بقدم چلتے تھے اسلامی دور میں مرو کی مدنی زندگی کا مرکز شہرستان سے گزر کر نہر مجان کے کنارے شہر کے مغربی مقامات میں قائم ہوا۔ جہاں زمانہ قبل اسلام میں نصرانی اسقفی علاقہ واقع تھا۔ ایران میں اصفہان بھی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا شہر تھا۔ پہلے یہاں شہرستان سے چند میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی ایک بیرونی نوآبادی تھی۔ دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر قدیم شہرستان کے مقابلے میں بلحاظ وسعت وآبادی دگنا ہوگیا۔

حاکمانِ صوبہ، صدر مقامات میں رہتے تھے، سرکاری دفاتر بھی یہیں ہوتے تھے۔ عربوں نے سرکاری ادارے زیادہ تر ان متمدن قوموں کی تقلید میں اختیار کئے تھے جن کو اب وہ اپنا اطاعت گزار بنا چکے تھے۔ خود سیدنا عمرؓ (۶۳۴ء تا ۶۴۲ء) کے عہد خلافت ہی میں ایرانی اثر ایک نہایت اہم عنصر بن چکا تھا۔ معتمدیوں اور حسابی صیغوں کی ابتدا بھی اسی زمانہ سے ہوئی۔ ان دفتروں کو دیوان کہا جاتا تھا، اور یہ لفظ دیوان غالباً ایرانی لفظ ہے۔ ان علاقوں سے جہاں پہلے سلطنت بازنطینہ کی حکومت رہی تھی، عربوں نے اس قسم کی کئی یونانی و لاطینی اصطلاحیں اختیار کر لی تھیں۔ مثلاً Quester کا لاطینی لفظ انھوں نے مصر سے لیا۔ عربی فتوحات کے بعد بھی دفتروں کے منشی و کاتب مقامی باشندوں میں ہی سے مقرر کئے جاتے تھے۔ اور یہ لوگ حسب موقع یونانی یا فارسی زبان استعمال کرتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جا کر کہیں عربی زبان حکومت کی کاروباری زبان قرار پائی۔ اسی زمانہ سے اسلامی سکوں پر خالص عربی یا اسلامی نقش مسکوک ہونے لگے۔ اس سے پہلے زر، ان علاقوں میں مضروب ہوتا تھا جہاں پہلے بازنطینی یا ایرانی حکومت تھی۔ بازنطینی علاقوں میں جو زر مسکوک ہوتا تھا اس پر بازنطینی طریقہ کے مطابق آتش کدہ کی قربان گاہ کی تصویر ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں عربوں کی فتوحات شروع ہوئی ہیں۔ بازنطینی علاقوں میں معیار زر سونا تھا۔ اور ایران میں چاندی۔ چنانچہ مسلمانوں کے نظام زر میں سونے کے دینار (لاطینی میں Dinarians) چاندی کے درہم (یونان میں Drachme ایران میں یہ اصطلاح سکندر کے حملہ کے بعد رائج ہوئی) اور تانبے کے فلس رائج تھے۔

دینار صرف دارالخلافہ میں مضروب ہوتے تھے۔ چنانچہ عہد بنی امیہ میں دینار کے دارالضرب دمشق میں اور عہد بنی عباس میں بغداد میں تھے۔ البتہ درہم صوبوں کے صدر مقاموں پر مضروب ہوتے تھے لیکن فلس کی قدر زر صرف مقامی تھی۔ مغربی ایران اور وسط ایشیاء میں دسویں صدی عیسوی میں صرف درہموں کو زر اور دینار کو ایک قیمتی دھات سمجھا جاتا تھا۔ دینار کا وزن آدھے تولہ سے کچھ کم اور درہم کا اس سے بھی کچھ کم ہوتا تھا۔ قدر کے اعتبار سے درہم، دینار کے بیسویں حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے سونے اور چاندی کی زری اکائیوں میں تناسب قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ قدیم ایرانی سلطنت سے لے کر زمانہ حال کی یورپی مملکت تک ہر حکومت نے سونے اور چاندی کی قیمتوں میں تناسب قائم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بایں ہمہ مستقل تناسب قائم کرنے میں ان سب کی کوشش ناکام ثابت ہوچکی ہیں۔ عربوں کی یہ کوشش بھی بارآور نہ ہوئیں کہ قیمتوں کا ایک مستقل تناسب قائم کردیا جائے۔ سونے کے تعلق سے چاندی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہا۔

حکومت کی مقامی روایتوں کا اثر صرف ان علاقوں کی سرحدوں تک محدود نہیں رہا جہاں یہ حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ خلافت کی حکومتی اور معاشی زندگی میں ہم کو مختلف زبانوں سے لی ہوئی اصطلاحوں کا عجیب مجموعہ ملتا ہے۔ وہ علاقے جہاں پہلے بازنطینی حکومت تھی ایرانی اصطلاحات چل پڑیں اور ان علاقوں میں جہاں پہلے ایرانی حکومت تھی، بازنطینی اصطلاحات رائج ہوگئیں۔ جس طرح قدیم زمانہ میں حکومت کے پیامبروں کو یا مختلف مقاموں کی کیفیتوں کو حاکموں تک پہنچانے کے لئے ڈاک خانہ استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح خلافت میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ مسلمان ڈاک خانے کو برید کہتے تھے۔ برید لاطینی لفظ Veredus سے ماخوذ ہے۔ گو خود یونانیوں نے رسل و رسائل کا پورا نظام ایرانیوں سے لیا تھا۔ یونانی اس کے لئے لفظ بھی ایرانی Angoros استعمال کرتے تھے۔ فن جنگ سے متعلق ایرانی لفظ جند کو عربوں نے زمانہ قبل اسلام ہی میں اختیار کرلیا تھا۔ یہ لفظ سب سے زیادہ شام میں استعمال ہوتا تھا جہاں فوجی چھاؤنیاں ترقی پاکر شہروں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ قدیم بازنطینی صوبہ کے اس علاقہ کو مسلمانوں نے کئی جندوں میں تقسیم کردیا تھا۔ صوبوں کے عامل یا تو امیر جند کہلاتے تھے اور یا امیر مصر (یہ لفظ یمنی الاصل ہے) مصر کو فارسی الاصل لفظ اُستاق سے ممتاز کیا گیا تھا کیونکہ استاق صرف زرعی بستی کے لئے بولا جاتا تھا۔ خالص عربی الاصل لفظ حاکم کے محافظ دستے (حرس اور فوجی پولیس (شرطہ) کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ شرطہ کا ایک خاص افسر ہوتا تھا

جو عامل کا گویا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے یہ ظاہری لوازم بھی عرب ایرانیوں ہی سے لیتے تھے۔ ایرانیوں کی ہیئت حکومت کو عرب ہمیشہ ایک قابل تقلید نمونہ تصور کرتے رہے لیکن خلفاء کو ایرانی نمونہ کا مطلق العنان بادشاہ بننے کے لئے کافی وقت لگا۔ عہد اموی میں خلفا کی حیثیت کسی ایرانی شہنشاہ کی سی اتنی نہیں تھی جتنی کہ ایک عرب شیخ یا سید کی طرح تھی۔ خلیفہ ولید اول کو بھی اپنی رعایا سے کہنا پڑتا تھا کہ وہ اس کو اس کا نام لے کر نہ پکارا کریں۔

دائرۂ حکومت سے قطع نظر مادی تہذیب کے میدان میں خلافت ایران سے زیادہ بازنطیہ کی ممنون ہے۔ مصری پارچہ بافی کی صنعت جب شام کے ساحل پر منتقل ہوئی تو اس سے نہ صرف ایران متاثر ہوا بلکہ ترکستان بھی اس کے زیر اثر آ گیا۔ مصری کپڑوں کے نام سے مختلف کپڑے شیراز اور ترکستان کے مختلف شہروں میں تیار ہوتے تھے۔ بعد کو مادی تہذیب کے معاملہ میں مسلمان چین کو پہلا اور یونان کو دوسرا درجہ دینے لگے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے ایک ایرانی مصنف عوفی اور پندرھویں صدی عیسوی کے ہسپانوی فارس کلاویجو نے مسلمانوں ہی کی تقلید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: خود چینیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جہاں تک صنعت وحرفت کا تعلق ہے صرف وہی ایک ایسی قوم ہیں جو اس معاملہ میں حقیقی نظر وبصر کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اور سوائے یونانیوں کے بقیہ تمام دوسری قومیں اندھی ہیں بلکہ یونانیوں کی (اور کلاویجو کے مطابق فرنگیوں کی) بھی صرف ایک آنکھ ہوتی ہے۔

لیکن علمی میدان میں بلاشبہ یونانیوں کو پہلا درجہ حاصل تھا۔ نصرانیوں کے زیر اثر یونانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا کام بالکل ابتدائی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہؓ جو یونانی علوم کا بڑا دل دادہ تھا۔ اپنی عمر کی چالیس بہاریں بھی نہ دیکھ سکا تھا کہ ۷۰۴ء میں انتقال کر گیا۔ جب اس کے باپ یزید کا ۶۸۳ء میں انتقال ہوا ہے تو اس وقت بہت کم سن تھا۔ بہر طور ہیئت، طب اور کیمیا کے بہت سے رسالوں کو عربی میں منتقل کرنے کا شرف اس کو دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پارس پتھر دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس سے مصنوعی طور پر سونا بنایا جاسکتا تھا۔ خالد شمالی شام کے شہر حمص کا امیر تھا۔ اس مقام پر کسی زمانہ میں سورج دیوتا کا مندر تھا۔ بعد میں یہاں نصرانیوں کا ایک بڑا گرجا تعمیر ہوا اور آخر میں اس کا ایک حصہ مسلمانوں نے مسجد میں تبدیل کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی تک اس عمارت کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ پر حسب سابق گرجا بنا ہوا تھا اور بقیہ حصہ مسلمانوں کی مسجد کے کام آتا تھا۔ ممکن ہے کہ

خالد کے زمانہ میں حمص میں نصرانیوں کے علاوہ بت پرست لوگ بھی موجود ہوں۔ شام کے تمام شہروں میں صرف حمص ہی ایسا مقام تھا۔ جہاں مسلمان فاتحوں کا نہایت پرجوش استقبال کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں کے نصرانی باشندے قیصر ہرقل کی مذہبی اصلاحوں کے مخالف تھے۔

یونانی تمدن سے مسلمانوں کا تعلق اسکندریہ اور شامی شہروں سے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود علمی اور ادبی علوم کی حد تک تمدنی سرگرمی کے مرکز دجلہ وفرات کے کنارے شہر کوفہ و بصرہ بھی رہے۔ یہ دونوں شہر سیدنا عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اسی عام عربی وضع پر بنے تھے۔ یعنی مختلف عربی قبیلوں کے لئے علیحدہ علیحدہ محلے اور آبادی کے بیچوں بیچ مسجد جامع اور دارالحکومت۔ بصرہ بعد میں ایک دوسری بستی کی طرف منتقل ہوگیا اور قدیم شہر کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ گوکوفہ کی اہمیت بہت پہلے ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی جامع مسجد اس وقت تک باقی ہے۔ ابھی تک اس مسجد کی تعمیر پر کافی غور نہیں کیا گیا۔ مسجد کی دیواریں ایرانی کاریگروں نے کسی بڑے دیرپا مسالہ سے تیار کی تھیں۔ یہ موضوع بڑا دلچسپ ہے خاص کر اس لئے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس میں اب تک کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ واسط کے کھنڈروں کی بھی ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی۔ یہ شہر بنی امیہ کے زمانہ میں دجلہ کی ایک شاخ کے کنارے آباد کیا گیا تھا۔ گو صدیوں تک یہ ایک صنعتی وتمدنی مرکز بنا رہا لیکن بنی امیہ کے بعد اس کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہیں رہی۔

آٹھویں صدی عیسوی میں کوفہ و بصرہ میں جیسی غیر معمولی علمی سرگرمی تھی ویسی کسی اور شہر میں نہیں تھی۔ ان دو شہروں میں تو مسلم عالموں، ان کے شاگردوں اور ان کی اولاد نے دینیات، فقہ اور متعلقہ علوم کی بنیاد رکھی۔ دینی علوم کے علاوہ ان شہروں میں لغویوں اور نحویوں کے مخصوص دبستان بھی تھے۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے رقابت ومسابقت رکھتے تھے۔ عربی زبان سے متعلقہ علوم کی ابتدا کرنے والوں میں ہمیشہ صرف عرب ہی نہیں تھے۔ بصرہ کے ایک نمائندہ خلیل ابن احمد نے عربی کی ایک اہم لغت تالیف کی ہے۔ اسی لغت کی بنیاد پر دسویں صدی عیسوی میں بمقام خراسان علمی وفنی اصطلاحات کی مشہور لغت تالیف ہوئی۔ خلیل نے ایک فرہنگ اصطلاحات بھی تالیف کی تھی۔ اس لغت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی علوم اور خصوصاً تقسیم علوم پر یونانی اثرات کس قدر کارفرما تھے۔ اساسی طور پر فلسفیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ نظری و عملی منطق کو بعضوں نے نظری فلسفہ میں شامل کیا تھا اور بعضوں نے اسے فلسفہ کی ایک ذیلی شاخ قرار دیا تھا اور بعض عالم اس کو حصول فلسفہ کا ''ایک ذریعہ'' خیال کرتے تھے۔ نظری فلسفہ کے پھر تین ذیلی شعبے تھے۔

طبیعیات، الٰہیات اور ریاضیات۔ ریاضیات کو دراصل طبیعیات والٰہیات کے بین بین جگہ دی گئی تھی۔ اس کے لئے عربوں نے یونانی اصطلاح کی بجائے خود اپنی ایک علیحدہ اصطلاح رکھی تھی۔ جس کے معنی یونانی اصطلاح ہی کے ہیں۔ ریاضی کے چار حصے تھے۔ حساب، ہندسہ، ہیئت اور موسیقی۔ یعنی وہ سات وفاغی فنون جو یورپ کے قرون وسطیٰ میں فنون اربعہ کہلاتے تھے۔ بعد میں ریاضی و منطق کو بعض وقت علوم موضوعہ میں شمار کیا جانے لگا۔ ان سے وہ علوم مراد تھے جو علوم طبعی اور دینیات یا مابعد الطبیعیات کی تعلیم کے لئے ضروری قرار دیئے گئے تھے۔ بہت سی دوسری اصطلاحوں کی طرح الٰہیات بھی ایک یونانی اصطلاح ہے۔ غرض بعد میں الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کو بہت سی ذیلی شاخوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن فی الحقیقت الٰہیات کی کوئی ذیلی شاخ نہیں ہے۔ البتہ علوم طبیعی کی بہت سی ذیلی ضمنیں تھیں۔ چنانچہ طبیعیات و کیمیا بھی ان ہی میں شامل ہے۔ عملی فلسفہ میں اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات شامل ہے۔ نحو، معانی و بیان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کو کسی ایک علم کے تحت نہیں رکھا گیا۔ البتہ ایک خاص باب نحو کے لئے مختص کیا جاتا ہے اور اس سے پہلے فقہ اور دوسرے دینی علوم سے بحث ہوتی ہے۔ ادب و تاریخ کا شمار سب سے آخر میں ہوتا ہے اور معانی و بیان کا ذکر منطق کے سلسلہ میں اس لئے کہ یہ منطق کی ایک ضمنی شاخ تصور ہوتی ہے۔